زرتاشیہ صغیر* ڈاکٹر طارق ہاشمی**

ترقی پسند غزل میں فلسفۂ اخلاق

Abstract: *"Ghazal is a cultural genre of persian and Urdu poetry. The poets of progressive movement promoted marxism which aimed to wipe out discrimination, class difference and prejudice from society. It is notable that ethics and social moral values are dominationg theme in their poetry because of their great stress on equality of a man in society and rights of a deprived and common man. In this way they proved to be a mouth piece of downtrodden and promoted realism in Urdu poetry by giving their revolutionary ideas".*

بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی انسان نے اپنی ذات سے متعلق پر اسراریت اور اپنے ارد گرد کے مظاہر پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی تعلق کی نوعیت کا پتا چلانے کی کوشش کی گئی جو اس سے پہلے اُردو غزل میں کم نظر آتی ہے۔ انسانی اعمال اور افکار کے باہمی رشتے کی وضاحت کی گئی اور اس کو فکرِ انسانی نے خاص طور پر اپنا موضوع بنایا۔ ادب میں بدلتی ہوئی اقدار کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید عابد علی عابد کہتے ہیں:

"ابدی حقیقتوں اور ازلی غایتوں کی جستجو ہمیشہ انسان نے کی ہے اور فن کار تو ایسا نظام دریافت کرنے کے درپے رہا ہے جو بنی نوع انسان کو ایک رشتہ میں پرو دے۔ اُردو کی جدید غزل فن کاروں کی اس نئی برادری کی اُخوت، نئی اخلاقی اقدار کے تعین کے لیے اضطراب اور ابدی صداقتوں کی جستجو کے لیے بے قراری کا اظہار کرتی ہے۔"(۱)

بدلتے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ اقدار کا چلن ہوا۔ اس دور میں مارکسی اخلاقیات، جدلیاتی اخلاقیات اور طبقاتی جدوجہد کی اخلاقیات کو فروغ ہوا۔ اس ضمن میں اردو ادب کی اہم ترین تحریکوں میں سے ایک ترقی پسند تحریک ہے۔ جو ایک خاص مقصدی رجحان کے ساتھ اُبھری۔ ۱۹۳۲ء میں افسانوں کی کتاب "انگارے" شائع ہوئی۔ جس کے مصنّفین میں احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل تھے۔

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

اس کتاب کو ضبط کر لیا گیا کیوں کہ اس میں قدیم روایات کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ مصنّفین زندگی کو اُس کے اصل روپ میں دیکھنے اور دکھانے کے خواہاں تھے اور کتاب کی ضبطی کے ردعمل میں مصنّفین نے مزید اس طرح کا ادب لکھنے اور اس کتاب کے دفاع میں رسالہ ''لیڈر'' میں بیانات جاری کیے جس میں واضح الفاظ میں یہ کہا گیا کہ وہ کسی طرح اپنی کتاب ''انگارے'' کی اشاعت پر نادم نہیں بلکہ ایک ''لیگ آف پراگرسیو آتھرز'' قائم کرنی کی تجویز پیش کی اور اس طرح پراگریسو کا ترجمہ ''ترقی پسند'' کیا گیا اور یہی افسانوں کا مجموعہ ترقی پسند تحریک کے آغاز کا سبب بنا۔ اس تحریک سے وابستہ مصنّفین کے نزدیک ادب کو حقیقی قدروں میں ڈھالنا تھا۔ غریبوں کے استحصال، بھوک، بیماری، جہالت اور مظالم کو موضوع بنایا گیا۔

ترقی پسندوں کے نزدیک ادب کا موضوع غریب لوگ ہیں جن کی حالت بدل کر ہی معاشرہ ترقی کر سکتا ہے۔ دراصل یہ تحریک کارل مارکس کے نظریات سے متاثر تھی۔ جس نے مزدوروں اور غریبوں کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ سجاد ظہیر جو کہ اس تحریک کے روحِ رواں تھے یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مغربی نظریات وخیالات سے خاصے مرعوب تھے اور کمیونزم کے حامی تھے۔ سجاد ظہیر نے ترقی پسند انجمن قائم کرنے کے سلسلے میں ۱۹۳۵ء میں ایک اعلان نامہ تیار کیا جس میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا:

> ''ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں۔۔۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو فروغ دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔۔۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشوونما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، پیاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم اُن تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔''(۲)

ترقی پسندوں نے ادب کی مقصدیت پر زور دیا ہے اور ادبی ذمہ داری قبول کریں کہ اُنہیں معاشرے اور عوام کی افادیت کے لیے ادب تخلیق کرنا ہے۔ ایسا ادب جو سماج میں جکڑے ہوئے عوام کو اپنے حقوق کے لیے لڑنا سکھائے اُن میں اپنی اہمیت کا شعور جگائے اور ایسا ادب جو غریبوں اور مزدوروں کو یہ آگاہی دے کہ امیر طبقہ جو محلات میں رہتا ہے اُن کی محنت کے بغیر محلات میں نہیں رہ سکتا تھا۔ ایسا ادب جو زندگی کے تلخ حقائق کو عوام کے سامنے لائے اور زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لیے کوشش کرے۔ ادب اور حقیقت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انجم اعظمی رقم طراز ہیں:

"ادب کلی حقیقت ہے جس میں خارج و باطن ایک ہو جاتے ہیں اور جس طرح انسان خارجی حقائق سے رشتہ جوڑ کر اپنے وجود کی تکمیل کرتا ہے اسی طرح انسانی تخیل سارے علوم کی دریافتوں کو اپنے اندر سمو کر اعلیٰ ادب کی تخلیق کرتا ہے اور اس بہانے سے اس متحرک انسان کی حقیقت دریافت کرنا ہے جو وقت کے بہتے دھارے میں مسلسل اپنے اندر و باہر کے انکشافات سے دوچار ہے۔"(۳)

ادب زندگی کی حقیقتوں کو آشکار کرنے کا نام ہے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک ادب ذوق کی تسکین کرنے کے ساتھ ساتھ مقصدیت کا حامل بھی ہو۔ منشی پریم چند جو کہ ترقی پسند تحریک کے اہم رکن تھے اپنے خطبے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"۔۔۔ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہو گی۔"(۴)

ترقی پسند تحریک نے خوابوں کی جگہ واقعیت اور حقیقت کو جگہ دی۔ معاشرے کے تلخ حقائق کو بے نقاب کیا اور انسانی کمزوریوں سے بھی پردہ اٹھایا۔ نفسیاتی اُصولوں کے تحت لاشعوری کوتاہیوں کو زیرِ بحث لایا گیا۔

ترقی پسندوں کے یہاں غریبوں کا استحصال، بے کسی و بے بسی کے خلاف آواز اُٹھانا، سرمایہ داروں کی بے جا مداخلت و مظالم کی مخالفت، متوسط اور غریب طبقے کی بنیادی ضرورتیں، بھوک اور افلاس کو ختم کرنا اور ہر طرح کے معاشرتی استحصال جیسی اقدار کو اپنایا گیا۔ جو فرد کو معاشرے سے الگ کر کے نہیں دیکھتیں بلکہ اُس کے نزدیک فرد اور معاشرہ دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ آلِ احمد سرور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ترقی پسند تحریک متوسط طبقے کے لیے ذہنی غذا فراہم کرنے کی بجائے ایک نئے اجتماعی نظام کی آواز ہے۔"(۵)

ترقی پسند شاعروں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے خلیل الرحمان اعظمی کہتے ہیں:

"ہر ترقی پسند شاعر کو رجائیت پر عقیدہ رکھنا چاہیے۔ غم، اداسی اور افسردگی اور اس طرح کی کیفیتیں اور اُن کا بیان معیوب ہے۔"(۶)

مزید اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ترقی پسند شاعری واضح اور کھلی ہونی چاہیے ظلم کو ظلم کہنے کے لیے استعارہ و تشبیہ کی حاجت نہیں۔"(۷)

ترقی پسند شعرا نے اپنی شاعری بالخصوص غزل میں اپنے انقلابی موضوعات کو اس طرح سمویا کہ غزل کی اسلوبی روایت بھی قائم رہی اور سماجی مسائل کو بھی بخوبی بیان کر دیا۔ اگرچہ ترقی پسند شعرا باغیانہ رویوں کے حامل تھے تاہم اُن کے فنی اظہار میں کلاسیکیت کا رنگ نمایاں ہے۔ خالد علوی ترقی پسند غزل گو شعرا پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”ترقی پسندوں نے غزل کے جس اسلوب کی تشکیل کی اس میں تنوع کے باوصف ایک ایسی انتخابی انفرادیت ہے جو داخلی سطح پر نئے تجربے کا اظہار اور خارجی سطح پر فن کی قدیم روایات کی توسیع اور چند مجہول روایات کی تردید سے عبارت ہے۔“(۸)

ترقی پسند شعرا کی غزل میں اُمید، انقلاب، ارتقا، عملِ مسلسل اور انسان دوستی جیسی اعلیٰ قدر موجود ہیں۔ اس نے تمام اصنافِ سخن کا تنقید کا نشانہ بنایا مگر غزل پر جہاں کی تنقید کی کہ یہ مطالب اظہار کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ وہاں خارجی کیفیات کے مشاہدات کی عکاسی داخلی کیفیات کے تجربات کے بغیر ناممکن نظر آئیں تو غزل کو اپنے مخصوص لب ولہجہ میں برتا گیا مگر غزل کی روایت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ترقی پسند شعرا کی لب ولہجے کی اس تبدیلی پر خلیل الرحمن اعظمی اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> ”وہ (جدید تر شاعر) زندگی کی وحدت کو اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ دیکھنا، برتنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ بھی نفی یا اثبات کا کوئی بنا بنایا بند کر کے رد کرنے کے حق میں ہے اور نہ آنکھ بند کر کے قبول کرنے کی تائید میں بلکہ وہ خود اپنی خواہش اپنے تجربے اور اپنے ادراک سے زندگی کی ماہیت اور حقیقت کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ یہ عمل بہت کٹھن ہے اور اُس کے سارے سہارے چھن چکے ہیں۔ اس لیے زندگی کا کرب اُسے اکیلا جھیلنا پڑتا ہے۔ تنہائی کا کرب، تلاش وجستجو کی اذیت، ان جانی چیزوں کا خوف اور جانی ہوئی چیزوں میں انجانی حقیقتوں کی موجودگی کا احساس جدید تر شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔“(۹)

ترقی پسندوں نے زندگی کی عصری خرابیوں کی نشاندہی کر کے سماجی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انسانیت کو مذہب بنانے اور احترامِ آدمیت کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ انسانی ارتقا اور جہد عمل جیسی اقدار کو اپنایا گیا۔ زندگی کو اُس کی تمام تر حقیقتوں سے دیکھنے کا اہم سمجھا گیا۔ خلیل الرحمن اعظمی ترقی پسند شاعری کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ”نئے شاعر نے واعظ ہی نہیں عاشق، رند، رومانی، باغی، مبلغ، مجاہد، انقلابی اور اشترا کی سب کے نسب نامے پھر اسے ایک بار آدم کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے اور آدمی کے چہرے سے اُوپری خول اُتار کر اُس کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔“(۱۰)

ترقی پسندی نے اُردو غزل کو عشق اور متعلقاتِ عشق کے موضوعات کو ثانوی حیثیت دے کر سماجی اور سیاسی حالات کی ترجمانی کو اولیت دی۔ غمِ جاناں پر غمِ دوراں کو اہمیت دی۔ حیات و کائنات سے انسانی تعلق اور مقصد تخلیق انسان، حسی اقدار کو زیر بحث لایا گیا۔ اردو غزل کے فکری و نظری دائرہ کار کو وسیع کیا اور عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دورِ حاضر کے مسائل اور بدلتی ہوئی اقدار کو موضوع سخن بنایا۔

ترقی پسند تحریک کے اولین شعرا میں جوش ملیح آبادی(۱۸۹۴ء۔ ۱۹۸۲ء) ایک اہم نام ہیں۔ جوش کی شاعری بھی اپنے دور کی غماز ہے جس دور میں سرمایہ داری نظام کے خلاف جدوجہد اپنے عروج پر تھی اور سرمایہ داری نظام نے نظام الاخلاق اور معاشرتی رویوں انسانیت کے معیار سے گرادیا تھا۔ ایسے میں جوش نے غزل کے روایتی مضامین کو ترک کر کے نئے اور حقیقت نگاری پر مبنی مضامین پر لکھا اور اپنے مخصوص اسلوب اور لہجے سے غزل کو معنی سطح پر وسعت بخشی۔

جوش نے اپنی غزلیات میں قوم کی بیداری کی اہمیت پر بہت زور دیا۔ اُن کے خیال میں وقت کی اہمیت قوم پر واضح ہونی چاہیے کیوں کہ وقت کو غفلت میں گزار دینے کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ چلا جائے اور اُس سے فائدہ اُٹھا کر تعمیری کاموں میں حصہ لیا جائے۔

جوش دنیا کی عزت و تکریم کو محض دھوکہ خیال کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دنیا کی حقیقت کچھ بھی نہیں اور اس فانی دنیا کی رنگینیوں کے دھوکے میں آنا بالکل فضول ہے۔

اٹھ ،کہ یہ موسمِ گل ، دم میں، گزر جائے گا
تو نہ چونکے گا تو کیا وقت ٹھہر جائے گا (۱۱)

مرا دل عزتِ فانی پر اترا ہی نہیں سکتا
ترے دھوکے میں اے دنیا کبھی آ ہی نہیں سکتا (۱۲)

جوش کے نزدیک عشق ہی تمام جذبات میں افضل ترین مقام رکھتا ہے۔ یہی عشق انسان کے قلب و نظر کو مقام ارفع بخشتا اور روح کی پنہائیوں تک اسرار و رموز کو وا کرتا ہے۔

جوش کے نزدیک جہاں عشق و محبت کے جذبات روح کی بیداری کا سبب ہیں تو روح کا بیدار ہونا، انسان کو انسان بھی بنا دیتا ہے۔ اور عرفان ذات کا سبب بنتا ہے:

گداز دل سے باطن کا تجلّی زار ہو جانا
محبت اصل میں ہے روح کا بیدار ہو جانا (۱۳)

آتا نہ ہو گا راس کسی کو نہ آئے عشق
ہم کو تو تیرے درد نے انسان بنا دیا (۱۴)

شاعری اور غم کا ہمیشہ سے ہی ساتھ ساتھ رہے ہیں یہ غم زمانے اور حالات کے زیر اثر ہونے والی تبدیلیاں اس کے محرکات ہوتے ہیں اور معاشرے کی بدحالی اور معاشرتی و سماجی ناہمواریوں نے "غم دوراں" کو اُردو غزل میں خاص جگہ دی ہے۔ بالخصوص بیسویں صدی کے شاعروں نے زندگی کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور غمِ دوراں کو غمِ جاناں سے اہم تصور کیا ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"غم دوراں کا یہ احساس صرف حسن و عشق کے معاملات ہی تک محدود نہیں رہا ہے اس کے اثرات زندگی کے تمام پہلوؤں پر ہوئے ہیں۔ اس نے غم نے زندگی کی سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی حقیقتوں کو سمجھنا بھی سیکھا ہے۔"(۱۵)

ترقی پسندوں کے یہاں غموں اور دکھوں کا سامنا کرنا بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرنا قدر کے طور پر موجود ہے۔ جوش نے بھی اسے زندگی کی حقیقت سمجھ کر تسلیم کیا ہے اور جب زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کے لیے انسان تیار ہو جائے تو نصف دکھ کو تو اُسی وقت مات دے دیتا ہے۔

راحت کا جہاں میں نام نہیں، ایذا کے سوا آرام نہیں
جس روز سے دل نے یہ سمجھا، اُس روز سے کوئی غم نہ ہوا (۱۶)

اس موضوع پر جوش کا ایک اور شعر ذیل میں دیا گیا ہے:

کثرتِ زخم سے اِک باغ ہے قلبِ انساں
تجھ کو اس باغ کی سوگند گلستاں ہو جا (۱۷)

جوش انسانی عظمت کے فلسفے سے بھی بخوبی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انسان ہی اس کائنات کا مرکز اصل ہے اور کائنات اس کے دم قدم سے ہے اور کائنات کی تخلیق کا مقصد بھی "انسان" ہی ہے۔ یہی انسان جب اپنے عمل اور جستجو سے آگے بڑھتا ہے تو تسخیر کائنات کر لیتا ہی۔ جوش کا تصور عمل بھی نہایت واضح ہے جوش کے خیال میں جب انسانی ذہن کی سرحدیں شعور و آگہی کو جا چھوتی ہیں تو انسانی ذہن عمل سرگرم پر تیار ہو جاتا ہے اور یہی عمل اس کی زندگی کو اچھا یا برا بنانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

سوارِ شمس و قمر ہوں، تو کیا تعجب ہے
کہ حرفِ کن ہے مرا جوش اولیں مرکب (۱۸)

آگہی کے عمل جزوی و کلی کی قسم
یہی دنیا ہے جہنم، یہی دنیا ہے بہشت (۱۹)

جوش نے اپنی غزل میں جس پختگی سے الفاظ وتراکیب استعمال کیے ہیں اس نے اردو غزل کو نئی معنویت سے آشنا کیا ہے۔

فراق گورکھپوری اُردو غزل کے اہم شاعر ہیں جو موضوعات کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں فانی، اصغر اور حسرت کے قریب رہے ہیں۔ ترقی پسند شاعر ہونے کی حیثیت سے آپ کی غزلیہ شاعری میں ترقی پسندانہ عناصر کی بھی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ فراق کی غزلوں میں اپنے معاشرے کی بہتری کے لیے کوششیں اور انقلاب کی اُمید واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ فراق نے اپنی غزلوں میں معاشرے کے ایسے سرمایہ دار حکمران جو خود خدا بن بیٹھے ہیں اور غریبوں کا سفاکانہ استحصال کر رہے ہیں۔ اُن کے خلاف آواز بلند کی ہے اور اُنھیں اُن کے مظالم سے روکنے کے لیے عوام کے جذبات کو اُبھارا ہے۔

جو خدا بنتے ہیں انسان بنانا ہے اُنھیں
کام رندوں کو بہت سے ہیں ابھی اے ساقی(۲۰)

فراق کے نظامِ اخلاق میں خود شناسی اور خود احتسابی انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ خود آگاہی کی منزل طے کرے اور اپنے آپ کے لیے خود حدود مقرر کر کے اُن کی پابندی کرے۔ اپنے لیے اخلاقیات کے اندر رہ کر ایسے ضابطے بنائے کہ اُن کا پابند رہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکے۔ فراق مذہبی ونسلی تفرقات سے بالاتر ہو کر ہر بڑے شاعر کی طرح محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دنیا کا کوئی بھی انسان ہو خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اُس کا مذہب یا نسل اہم نہیں بلکہ انسانیت کا رشتہ اہم ترین ہے اور جس کی اساس محبت ہے۔

میرا اخلاق نہیں خوفِ خدا کا ممنون
ہے کسی کو جو مجھے ڈر تو وہ ہے ڈر اپنا (۲۱)

کفر و ایماں سے رکھ معاف کہ ہم
رکھتے ہیں مذہبِ محبت اور (۲۲)

فراق عظمت انسان سے بخوبی واقف ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ انسان ہی اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہے جس نے مہر و ماہ کو تسخیر کیا ہے اور اگر زمین کی بات ہو تو یہ قدرت کے چھپے خزانے دریافت کر لیتا ہے اور اس کائنات کا محور و مرکز انسان کو قرار دیتے ہوئے فراق یوں کہتے ہیں:

یہ فیض آدم خاکی زمین سونا اُگلتی ہے
اسی ذرّے نے دور مہر و ماہ و مشتری بدلا (۲۳)

اسی طرح شانِ آدمیت کا اظہار فراق کے ایک اور شعر میں یوں کیا ہے:

آنکھیں تو ہیں وہ جو دیکھ پائیں
ہر ذرہ میں شانِ آدمیت (۲۴)

دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح فراق کے یہاں ارتقا کا تصور بہت واضح ہے۔ اُن کے نزدیک زندگی مسلسل آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے۔ فراق نے انسان کے لیے مسافر بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ جو زندگی کا سفر اپنی منزل کی جستجو میں جوش اور ولولے سے طے کرتا چلا جائے۔ فراق زندگی کے مسلسل حرکی اور ارتقائی عمل کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے۔ ایسے میں اُن کے نزدیک زندگی کا دوسرا نام انقلاب اور تبدیلی ہے۔

بڑھے چلو سوئے منزل دوست
حرکت میں مسافر ہے برکت (۲۵)

کون رکھ سکتا ہے اس کو ساکن و جامد کہ زیست
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب (۲۶)

پرویز شہریار فراق کی غزل میں فلسفۂ اخلاق پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جنت اور جہنم، خیر و شر اور تقدیر اور عمل انسان کی قوتِ ارادی کا کافی دخل ہوتا ہے انسان ہی مرکز کائنات ہے۔“(۲۷)

مخدوم محی الدین (۱۹۰۸ء۔۱۹۶۹ء) کا شمار ترقی پسند تحریک سے وابستہ اُن اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے ابتدا سے ہی اپنی شاعری کا مخصوص لب و لہجہ اور انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ مخدوم نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم میں نیا شعور اور نیا جذبہ پیدا کیا اس طرح اُن کی شاعری نئی سمتوں اور نئی راہوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مخدوم کی ابتدائی شاعری میں رومانی و انقلابی شاعری کا

امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں فرسودہ مضامین سے اجتناب کیا ہے اور اگر کہیں روایتی مضمون کو بھی بیان کیا تو منفرد لب ولہجہ اپنا کر اُسے نکھار دیتے ہیں۔ مخدوم کیمونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن رہے اور انجمن ترقی پسند مصنّفین سے منسلک ہونے کے باعث عوام کے استحصال، غلامی، نسلی امتیازات سے نفرت کی واضح گونج اُن کے کلام میں ملتی ہے۔ مخدوم نظم گو شاعر ہیں اگرچہ غزلیں کم ہی کہی ہیں۔ مگر اُن کی غزلیات بھی اُن کے انقلابی افکار کی ترجمانی کرتی ہیں۔ داؤد اشرف مخدوم کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”مخدوم نے انسانی فلاح اور بہبود، عدل و انصاف اور امن و امان سے متعلق خیالات، مارکس، لینن اور دوسرے اشتراکی مفکروں سے لیے لیکن طرزِ اظہار کو حسین اور موثر بنانے کے لیے اُنھوں نے اُردو اور فارسی کے شعرا کے طرزِ بیان سے استفادہ کیا۔“(۲۸)

مخدوم اپنے عہد کی تحریکوں اور مشاہیر عالم سے بہت متاثر تھے۔ اعلیٰ انسانی اقدار کو اپنانے کا رجحان اُن کے یہاں نمایاں ہے۔ مخدوم اپنے زمانے کے دکھ اور درد کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے عہد کی سیاسی فضا نفرت، ظلم اور ناانصافی کی گھٹن سے آلودہ ہو گئی تھی اور وہ ان حالات کو کس کرب سے بیان کرتے ہیں:

سن رہا ہوں حوادث کی آواز کو پا رہا ہوں زمانے کے ہر راز کو
دوستو اُٹھ رہا ہے دلوں سے دھواں، آنکھ لینے لگی ہچکیاں دوستو (۲۹)

اپنے سماج کی ناہمواریوں سے بخوبی واقف ہونے کے باعث ان حالات کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کرنے کے جذبے کو مقدم جانتے ہیں:

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے، دم شعلہ ساز ساتھ رہے (۳۰)

مخدوم کی انقلابی فکر اُن کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور بے بسی سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ انسانی زندگی کو پر سہولت بنانے اور اُس کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے تمنائیں دل میں رکھتے ہیں۔ مگر حالات کی بے رحمانہ حقیقت سے سامنا ہو جانے پر دکھی ہو جاتے ہیں:

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخی ایام چھبتی ہے (۳۱)

مخدوم انسان اور حیات کے تعلق اور اس کے ارتقائی سلسلے کو بھی بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں وہ جذبۂ عشق میں مسلسل ترقی کو کامیابی کا راز جانتے ہوئے کہتے ہیں:

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا تیرا نقشِ کف پا آخر شب (۳۲)

حیات و کائنات اور انسانی تعلق کو واضح کرنا مخدوم کا خاص وصف ہے۔ وہ انسان دوستی کے بھی قائل ہیں اور انقلاب کے لیے حیات و کائنات سے متعلق لوازمات اور زمانے کو ساتھ لے کر چلنے کے بھی قائل ہیں۔ اسی موضوع پر آپ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

حیات لے کر چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو سات لے کے چلو (۳۳)

زندگی میں آنے والی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لیے باخوشی ہمت اور حوصلے سے کام لیا جائے۔ اسی موضوع کو یوں بیان کرتے ہیں:

ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم
مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے(۳۴)

مخدوم کی غزلیں اُن کے انقلابی فکر کی ترجمانی کرتی ہیں وہ اپنے عہد کی حقیقتوں کو آشکار کرتے ہوئے انسان دوستی، عوامی فلاح و بہبود، محبت اور نسلی تفرقات کے خاتمے جیسی اقدار کو اپنے اچھوتے انداز بیان سے اپنی شاعری کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۸۴ء) بیسویں صدی کے اہم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کی اور اپنے کلام میں انقلابی موضوعات کا اظہار کیا۔ ایسا انقلاب جو عوامی ہو جو انفرادی اور اجتماعی آزادی کا باعث بنے جو غریبوں اور لاچاروں کے ہر طرح کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کا باعث بنے اور اُسے آگے بڑھ کر روک دے۔ امن، آزادی، انسان دوستی، انصاف کی طلب اور حب الوطنی جیسی اخلاقی اقدار فیض کے کلام کا حصہ ہیں بلکہ فیض کی پہچان ہیں۔ جو اُنھیں اُردو شاعری کا ''انقلابی شاعر'' بناتی ہیں۔

فیض کے یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس بات کا ادراک واضح ملتا ہے کہ تمام طاقتوں اور بادشاہت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کہ تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے اُسی نے انسان کو امانت کے طور پر اختیارات دیئے ہیں لہٰذا اُن اختیارات کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

ملتا ہے خراج اُس کو تیری نانِ جویں سے
ہر بادشاہِ وقت تیرے در کا گدا ہے (۳۵)

فیض کمیونسٹ پارٹی کے اہم اور سرگرم رکن رہے۔ آپ اہم ترقی پسند شاعر سمجھے جاتے ہیں مگر آپ کے کلام میں انقلاب کسی بھی تخریب کا نتیجہ نہیں بلکہ جہدِ مسلسل عمل کی طاقت اور پر امن مستقبل کی اُمید پر قائم ہے۔ڈاکٹر ظفر اقبال اسی ضمن میں رقم طراز ہیں:

"فیض کی ترقی پسندی کا اصل جوہر بھی صرف مزدور، کسان یا صرف معاشی استحصال کے لیے ہی نہیں بلکہ اس استحصالی قوت کے خلاف تھا جو احترام انسانیت یا حقوق انسانی کے منافی ہو سکتا تھا یعنی اُن کی شعری بوطیقا کسی خاص فرد یا طبقے سے نہیں بلکہ کل نوع انسانی کی ہیئتِ اجتماعیہ سے کلام کرتی ہے۔"(۳۶)

فیض کے یہاں استحصال سے جہاں نفرت پائی جاتی ہے وہاں اُنہوں نے اس کے خلاف ڈٹ جانے اور ہمت و حوصلے سے کام لینے پر بھی زور دیا ہے۔ مظالم کے خلاف حوصلہ بلند رہنا اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنا فیض کے یہاں قدرے نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی ضمن میں فیض کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے (۳۷)

فیض کی شاعری میں زندگی اور اس کی حقیقتوں کے ادراک کا تصور بہت توانا ہے۔اُن کے یہاں مستقبل کے امکانات کا تصور بھی بہت واضح ہے۔ اُمید انقلاب کے بارے میں بات کرتے ہوئے فیض کہتے ہیں:

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے (۳۸)

فیض کے کلام میں زندگی کی مقصدیت کا تصور نہایت توانا ہے اُن کے یہاں زندگی کا مقصد جہد مسلسل اور حق پر ڈٹے رہنا ہے۔ اُن کے نزدیک منزل اور انسان کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہونی چاہیے۔ منزل تک پہنچنے کے لیے جان تک لڑا دینی چاہیے۔ فیض کے تصورات کی عکاسی اُن کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا (۳۹)

مقام فیض کوئی رہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے (۴۰)

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں (۴۱)

فیض کے یہاں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ہر مشکل سے گزر جانے کا حوصلہ پایا جاتا ہے جو اُن کے یہاں بنیادی قدر کے طور پر موجود ہے:

فیض آتے ہیں رہِ عشق میں جو سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے(۴۲)

فیض نے دوستی کو امن عالم کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک تفرقات بدامنی کا باعث ہیں۔ محبت جو انسانیت کے احترام کا بنیادی جزو ہے اُس کے لیے ذات پات اور مذاہب کی تقسیم کوئی اہمیت نہیں رکھتی:

میدانِ وفا دربار نہیں،یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں کچھ عشق کسی کی ذات نہیں (۴۳)

فیض کے کلام کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ذات کی بات کرتے ہوئے اجتماعی سطح تک لے جاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دوسروں کے دکھ درد، سمجھنا اور بانٹنا انسان دوستی کے لیے لازمی ہے:

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے (۴۴)

اسی ضمن میں پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"فیض کے نزدیک فرد کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد میں شرکت کرتے۔ وہ فطرت سے ہم آہنگی نہیں بلکہ فطرت اور کائنات کی تسخیر کر کے حیاتِ انسانی کی فلاح کے لیے کوشاں ہو یعنی فرد کی پہچان اور معنویت سماجی حوالے سے قائم ہوتی ہے۔"(۴۵)

فیض ہر کسی سے اچھا برتاؤ رکھنے کے قائل ہیں۔ فیض کے یہاں اخلاقی اقدار کا تصور بھی منفرد انداز میں اُبھرتا ہے جب وہ غمِ جہاں اور دشمن سے بھی عاشقانہ سلوک کرنے کی بات کرتے ہیں:

غمِ جہاں ہو، رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا (۴۶)

فیض سامراجی نظام، سرمایہ داری نظام اور ان کے ہاتھوں مزدوروں اور عوام کے استحصال سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر ان سب نفرتوں کے برعکس اُن کا جذبہ محبت، اُمید، امن اور آزادی کی خواہش، انسان اور انصاف دوستی کی بازگشت اُس نفرت پر حاوی آجاتی ہے۔ جو اُن کی مثبت سوچ کی آئینہ دار ہے۔ فیض نے اخلاقی اقدار کو اردو غزل میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ محض ایک طبقے یا قوم کے لیے مخصوص ہو کر نہیں رہ گئیں بلکہ انھیں عالمی سطح پر پیش کیا ہے جو اُنہیں آفاقی شاعر بنا دیتی ہیں۔

اُردو شاعری کا اہم نام اور ترقی پسند تحریک کا اہم ستون کیفی اعظمی(۱۹۱۹ء۔ ۲۰۰۲ء) جنھوں نے اپنی زندگی مزدوروں اور محنت کشوں کے لیے وقف کر دی۔ ساری زندگی غریبوں اور مزدوروں کی زبوں حالی دور کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ کیفی نے اپنی آواز کو اپنی عوام کی آواز بنا کر پیش کیا۔ سیاسی اور سماجی سطح پر غریبوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔ ترقی پسندانہ نظریات کے حامل کیفی اعظمی اپنے سماج کے معاشی اور معاشرتی نظام میں ہونے والی ناانصافیوں، انسانیت کی توہین، اقدار کی پامالی اور فرسودہ جاگیردارانہ نظام کو معاشرے کی خوش حالی میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں وہ اپنے معاشرے کی سچی تصویریں بنا کر ٹھوس حقائق کو ہمارے سامنے لے آئے ہیں۔ اسی ضمن میں اُن کی غزل کے دو شعر ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

یہ صدی دھوپ کو ترستی ہے
جیسے سورج کو کھا گیا کوئی
ایسی مہنگائی ہے کہ چہرہ بھی
بیچ کے اپنا کھا گیا کوئی (۴۷)

زندگی کے ایسے سفاکانہ و بے رحمانہ مشاہدات جہاں انسان اپنے سماجی و معاشی حالات کے پیشِ نظر اپنی پہچان اپنی شناخت اور اپنا تشخص تک کھو بیٹھتا ہے۔ ان کی کیفی نے بھرپور انداز میں مذمت کی ہے۔ کیفی کی شاعری کے حوالے سے پروفیسر شمیم حنفی کہتے ہیں:

''انہیں سطح کے اوپر تیرتی ہوئی حقیقتوں، انسانی صورت حال کی ٹھوس اور ارضی بنیادوں اور جیتی جاگتی سچائیوں کے بیان سے غرض تھی۔''(۴۸)

کیفی نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام کو غزل میں داخل کیا ہے اور جہاں مسائل کی بات کی ہے وہاں ایسے پر امن اور خوشحال معاشرے کی خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے جہاں ظلم و جور کا تسلط نہ ہو اور اپنے انقلابی تصورات میں نئے جہاں کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمیں نیا آسماں نہیں ملتا
نئی زمیں نیا آسماں بھی مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا (۴۹)

کیفی ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن رہے اور سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ وہ انقلاب کے لیے عوام کے اپنے حق کے مطالبے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں:

خار و خس تو اُٹھیں راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے (۵۰)

کیفی کے یہاں تقدیر و تدبیر کا تصور بھی ملتا ہے مگر بلند حوصلگی سے ظلم کے خلاف ڈٹ جانا بھی پایا جاتا ہے۔ مظلوم کا ظلم سہنا اور آواز بلند نہ کرنا ظالم کو بچانے کے مترادف ہے۔ ظلم کے خلاف نعرۂ حق بلند کرنا اور جو مظالم کا ذمہ دار ہے اُسے بھی اُس کے ظلم کی سزا بھگتنی پڑے۔ اس اخلاقی موضوع کا اظہار یوں کرتے ہیں:

گر ڈوبنا ہی اپنا مقدر ہے تو سنو
ڈوبیں گے ہم ضرور مگر ناخدا کے ساتھ (۵۱)

پروفیسر سید مجاور حسین کیفی کی شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

"اسی عہد کے شاعروں کی طرح کیفی بھی اپنے خیالات کو زبان کا لباس بنا کر ہندوستان کو دکھاتے تاریخ کے ہر موڑ پر اُنھوں نے خود کو عوام کے جذبات سے ہم آہنگ کرنا چاہا یا یوں کہیے کہ عوام کو اپنے احساسات تحفے کے طور پر دیئے۔"(۵۲)

کیفی اپنے دور کے منفرد شاعر ہیں۔ جنھوں نے انسانیت کے مسائل کو نہ صرف موضوع بنایا بلکہ اُن کی نظر مسلسل عوام کے بہتر مستقبل کی طرف رہی۔ کیفی کے یہاں بھی دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح انقلاب ترقی اور عوام کے مسائل کا حل جیسی اقدار نمایاں نظر آتی ہیں۔ کیفی کے یہاں زندگی کے مقاصد کو حاصل کرنے کا جنون بھی قدر کے طور پر نظر آتا ہے۔ جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

میرے جنون پرستش سے تنگ آ گئے لوگ
سنا ہے بند کیے جا رہے ہیں بت خانے (۵۳)

کیفی نے اپنی غزلوں میں خود اعتمادی، باطل کے آگے ڈٹے رہنا، مقصد کے حصول کے لیے جنون اور جہدِ مسلسل جیسی اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا ہے۔ زندگی کے تضادات اور محنت و سرمایہ جیسے موضوعات کو معاشرتی زندگی کے پس منظر میں اپنی غزل میں جگہ دی ہے اور سماج کے مشاہدات و تجربات کو بھرپور شعور و آگہی سے برتا ہے۔

ظہیر کاشمیری (۱۹۱۹ء۔۱۹۹۴ء) نے اپنے کلام میں انسان کے تشخص کی حفاظت، عظمتِ آدم، عصری صداقتوں اور حیات و کائنات کے نظریات کے ساتھ ساتھ انقلاب پسندی جیسے موضوعات کو برتا ہے۔ ظہیر کاشمیری حیات و کائنات کے متعلق سائنسی نکتہ نگاہ رکھنے والے شاعر ہیں۔ اُن کے کلام میں حیات و کائنات کا وسیع تصور پرت در پرت کھلتا جاتا ہے۔ اُنہوں نے شاعری کو ہیئت اور فکر دو الگ الگ جہتوں کے طور پر نہیں لیا بلکہ ظہیر نے دونوں کو بدلتے وقت سے آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن کے یہاں جس خوبی سے فکر و فن یکجا ہوئے ہیں۔ اُردو شاعری میں اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ظہیر کاشمیری کے یہاں انقلاب، عظمتِ آدم، حیات و کائنات کے اسرار رموز سے آگہی اور جذبۂ عمل جیسی اقدار نمایاں ہیں۔

ترقی پسند تحریک جس کی بنیادی قدر غریبوں کے استحصال کا خاتمہ ہے اور استحصال کرنے والوں کے خلاف آواز بلند کرنا، گویا انسانی ارتقا اور انقلاب زمانہ اہم ترین قدر کے طور پر اُبھری۔ ظہیر کاشمیری بھی مارکسسٹ نظریات کے حامل اور اہم ترقی پسند شاعر ہیں۔ اُنہوں نے زمانے میں مثبت تبدیلیوں کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے اور اپنی شاعری میں "انقلاب" برپا ہو جانے کی بھرپور اُمید کا اظہار یوں کیا ہے:

ترتیبِ گلستاں خوب سہی، ترتیب گلستاں بدلے گی
جب وسعتِ امکاں بدلی ہے تقدیر بہاراں بدلے گی
اے حسنِ جہاں بیچارگیِ آشفتہ سراں پر طنز نہ کر
اب شکلِ گریباں بدلے گی اب صورتِ داماں بدلے گی
بجلی کا خطر، صرصر کا اثر، ان سے تو ظہیر اب خوف نہیں
دستور گلستاں بدلے گا، روداد گلستان بدلے گی (۵۴)

ترقی پسندوں کے یہاں غمِ دوراں کا موضوع بھی نمایاں ملتا ہے۔ ظہیر کاشمیری بھی انسانی حیات کے خارج پر نظر رکھنے والے ہیں۔ وہ زندگی اور اس کے معاملات میں ادراکِ حقیقت کو مقصدِ حیات قرار دیتے ہیں۔ اُن کا فن حسن اور خیر بانٹنے پر مبنی ہے۔ اُن کی

غزلوں میں غمِ دنیا اور غمِ روزگار کا شدید احساس پایا جاتا ہے اور جہاں تک اُن کی غزلوں میں ہیئت و فن کے تعلق کی بات ہے تو ظہیر نے کلاسیکی تشبیہات و استعارات اور تمثیل نگاری سے جدید غزل کو آراستہ کیا ہے۔ ظہیر کے یہاں غمِ جاناں پر غمِ دوراں کی ترجیح کا رنگ بھی نمایاں ہے۔

جوانی کو سپردِ سوز دوراں کر رہا ہوں میں
باندازِ دگر جینے کا ساماں کر رہا ہوں میں (۵۵)

اسی موضوع پر ظہیر کا ایک اور شعر ذیل میں دیا گیا ہے:

غمِ حبیب کے سانچے بہت پرانے ہیں
غمِ حیات کے سانچوں میں آج ڈھل کے چلو (۵۶)

ظہیر ایسے ادب کے قائل نہیں ہیں جو محض انسان کے داخلی رویوں کی ترجمانی کرے۔ وہ ایک ایسے ادب کی تخلیق کے متمنی ہیں جو غور و فکر پر مجبور کر دے اور اپنے ماحول اور سماج کے مسائل اور اُن کے حل کو بھی نظر میں رکھے۔ قومی مسائل کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اپنے وطن کو گلشن کہہ کر اُس کے پس منظر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قوموں کے لیے لازم ہے کہ اپنا ماضی فراموش نہ کریں کیوں کہ وطن گلشن کی مانند ہے اور اسے سنوارنے اور سینچنے کے لیے جو محنت کی گئی ہے اُسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا جائے۔

پسِ منظر گلشن میں تیرے پیشِ نظر ہے
اِک رقص بہاراں ہی میرا کام نہیں ہے (۵۷)

ظہیر ادب میں حقیقت نگاری کے قائل ہیں اُنہوں نے اپنی شاعری خصوصاً غزلوں میں قومی اور بین الاقوامی مسائل کو شامل کیا ہے۔ اُن کی غزلوں میں "حرکت" کا پہلو نظر آتا ہے۔ زمانہ مسلسل حرکت اور ارتقا کے عمل سے گزر رہا ہے تو زبان و ادب بھی ایک حرکی عمل ہے۔ لازماً ایسا ادب جو عصری تقاضوں کو پورا کرے تخلیق کیا جانا چاہیے۔ ظہیر کے یہاں حرکی توانائی کا جذبہ بھرپور انداز میں نظر آتا ہے اور انفرادی طور پر باعمل رہنے کے جذبے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم اپنی تخریب کر رہے ہیں ہماری وحشت کا کیا ٹھکانہ
فضا میں بجلی نہ ہو تو خود ہی اجاڑ دیتے ہیں آشیانہ (۵۸)

جہاں فضاؤں میں بجلیوں کی بات کرتے ہوئے قوم کو سرگرمِ عمل رہنے کی تلقین کرتے ہیں وہاں انقلاب کے لیے مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی بات کرتے ہیں جن کے ارادے پختہ ہوں وہی لوگ اس کٹھن سفر کو طے کر سکتے ہیں۔ زمانے میں تبدیلی اُن ہی افراد کی بدولت ہے جو سخت مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں اور مستقل مزاجی سے اپنا سفر جاری و ساری رکھتے ہیں۔

جو تند بگولوں سے اُلجھے وہ عزم سفر کی بات کرے
اس منزل نو کے رستے میں کتنے ہی بیاباں آتے ہیں (۵۹)

انسانی عظمت اور آزادی کے حوالے سے فلسفیانہ انداز میں موضوعات کو برتنے والے ظہیر کاشمیری کے بارے میں پروفیسر سجاد حارث یوں رقم طراز ہیں:

"ہم عصر تاریخ کا کوئی ایسا واقعہ یا آزادی یا انسانی حقوق کی خاطر کی جانے والی کوئی ایسی جدوجہد بیکار نہیں جس نے اُن کے فکر و جذبہ کو تحریک نہ دی ہو اور جسے اُنہوں نے فن کے سانچے میں نہ ڈھالا ہو۔"(۶۰)

ترقی پسند شعرا کے فلسفۂ اخلاق کا سب سے نمایاں وصف اپنے وجود کا احساس اور وجود کی بقا اور حرمت کا احساس جو ساحر لدھیانوی (۱۹۲۱ء۔۱۹۸۰ء) کی شاعری میں نمایاں ملتا ہے۔ ساحر کی شاعری پر یہ بات کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی یوں رقم طراز ہیں:

"ساحر کے فن کی خصوصیات میں احساس کی شدت سب سے ممیز اور نمایاں ہے اور چونکہ اس کا احساس زندہ اور بیدار ہے۔ اس لیے اس کی انفرادیت کسی قسم کی بیرونی اثرات کی شرمندہ احساس نہیں۔ اُردو کے جدید شعراء میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔۔۔ جدید ترین شعرا میں مجھے ساحر کی سی مکمل انفرادیت کہیں نظر نہیں آتی۔"(۶۱)

شکایتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں کسی سے کوئی اُمید ہو جب اُمید ہی ختم ہو جائے تو گلے شکوے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی موضوع کو یوں بیان کرتے ہیں:

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ اُمید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم (۶۲)

ساحر کے نزدیک گلہ نہ کرنا بھی شکر گزاری کے ضمن میں آتا ہے۔ کسی سے اُس کے برے رویے کا گلہ نہ کرنا دراصل صبر کی دوسری شکل ہے اور اسی سے انسان کے اندر شکر اور بردباری جیسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ شکایتیں ہونے کے باوجود اپنی زبان کو گلے شکوے سے محفوظ رکھنا ساحر کے یہاں نمایاں قدر ہے۔

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں (۶۳)

ساحر کے اخلاقی تصورات میں اگرچہ فلسفے کی بہت گہرائی دکھائی نہیں دیتی تاہم انسانی احترام ان کے ہاں بنیادی قدر کے طور پر نظر آتا ہے وہ جب احترامِ انسانیت کی بات کرتے ہیں تو ترقی پسندوں کے افکار کی کھل کر عکاسی کرتے ہیں کہ انسان جب کسی بھی دوسرے انسان کو حقیر جان کر اُس کی تذلیل کرتا ہے تو یہ نہایت افسوس ناک بات ہے۔ ساحر کے نزدیک انسان خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو خواہ مزدور ہو یا کسان ہر حال میں وہ قابلِ احترام ہے۔

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی (۶۴)

معاشرے کی ناہمواریوں پر کڑھتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ ساحر نہایت حساس دل رکھنے والے شاعر ہیں۔ وہ ایک پرامن معاشرے کی تشکیل کے حامی ہیں۔ جہاں پر ایک خوشحال معاشرہ ہو اور جب ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تو اپنے ہی بیداریٔ احساس پر کڑھتے ہوئے کہتے ہیں:

نالاں ہوں میں بیداریٔ احساس کے ہاتھوں
دنیا میرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی (۶۵)

ساحر اپنی غزل میں اپنے لوگوں کو یہ پیغام دیتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں کہ اپنی حالت بدلنے کے لیے خود کوشش کی جائے نہ کہ انسان بے بس ہو کر بیٹھ جائے اور جو ایسے ظلم سہنے اور اپنے حالات بدلنے کا نہ سوچیں تو خدا تو بھی ایسوں کے حالات نہیں بدلا کرتا۔

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی (۶۶)

ظلم کے خلاف ڈٹ جانے کا درس بھی ساحر کے یہاں ملتا ہے۔ اُن کے نزدیک مشکلات اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا اعلیٰ اخلاقی قدر کے طور پر موجود ہے اور زندگی ہمت سے گزاری جائے خواہ وہ بزدل لوگوں کی زندگی سے کم ہی ہو۔ اسی موضوع پر ساحر کے دو شعر ملاحظہ کریں:

نہ منہ چھپا کے جئے ہم، نہ سر جھکا کے جئے
ستم گروں کی نظر سے نظر ملا کر جئے
اب ایک رات اگر کم جئے تو کم ہی سہی
یہی بہت ہے کہ ہم مشعلیں جلا کر جئے (۶۷)

اپنے حقوق کے لیے لڑنے کا جذبہ بیدار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زندگی بھیک میں نہیں ملتی، زندگی بڑھ کے چھینی جاتی ہے
اپنا حق سنگ دل زمانے سے چھین پاؤ تو کوئی بات بنے (۶۸)

ساحر رنگ، نسل اور مذہب جیسے تفرقات کو مٹا کر انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ سب چیزیں احترامِ آدمیت کے آگے ہیچ ہیں:

رنگ اور نسل ذات اور مذہب جو بھی ہے آدمی سے کم تر ہے
اس حقیقت کو تم بھی میری طرح مان جاؤ تو کوئی بات بنے (۶۹)

ترقی پسند تحریک کی غزل حقیقت پسندی کا اظہار ہے۔ زندگی اور اس کی قدروں کو حقائق کی روشنی میں پرکھنا اور عوام کے سامنے جوں کا توں پیش کر دینا ترقی پسند شعرا کے نظریات کی بنیاد ہے۔ غریب اور استحصال زدہ عوام اور مزدور طبقے کی بھرپور نمائندگی کرنے والے ترقی پسند شعرا نے جاگیردانہ نظام اور ظلم کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کا اظہار کیا ہے۔ انسانی حقوق کی حفاظت، احترامِ آدمیت، انسان دوستی، بھائی چارہ، معاشرتی مساوات اور انسان کی ذہنی و فکری ارتقائی عمل کی سعی، ترقی پسند تحریک سے وابستہ غزل گو شعرا کے فلسفۂ اخلاق کی اہم اِقدار کے طور پر موجود ہیں۔ جنہوں نے معاشرتی سطح پر طبقاتی کش مکش کو ختم کرنے کی کوششوں کو عمل کو تیز تر کرتے ہوئے جبر و استبداد کی روک تھام میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو غزل کو فنی و فکری اعتبار سے وسعت عطا کرتے ہوئے نئے امکانات کے در وا کئے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ عابد علی عابد، سید، تنقیدی مضامین، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۶ء، طبع اول، ص ۲۱۰
۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۱۳ء، طبع ہشتم، ص ۴۴۰۔۴۴۱
۳۔ انجم اعظمی، ادب اور حقیقت، کراچی: کراچی اشاعت گھر، ۱۹۷۶ء، ص ۴۹
۴۔ خالد علوی، غزل کے جدید رجحانات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء، ص ۶۷
۵۔ آلِ احمد سرور، تنقید کیا ہے؟ کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، س ن، ص ۱۶۵
۶۔ خالد علوی، غزل کے جدید رجحانات، ص ۱۰۴
۷۔ ایضاً، ص ۱۰۴ ۸۔ ایضاً، ص ۹۰
۹۔ شاذ تمکنت، ڈاکٹر، مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے، حیدر آباد: مکتبہ شعر و حکمت، ۱۹۸۶ء، ص ۲۰۵۔۲۰۶
۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰۶
۱۱۔ جوش ملیح آبادی، غزلیاتِ جوش، مرتب: وسیم عباس گل، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۶ء، ص ۳۹
۱۲۔ ایضاً، ص ۴۲ ۱۳۔ ایضاً، ص ۴۳ ۱۴۔ ایضاً، ص ۴۵
۱۵۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی تجزیے، ۱۹۵۹ء، ص ۲۶۶
۱۶۔ غزلیاتِ جوش، ص ۶۷
۱۷۔ ایضاً، ص ۶۱ ۱۸۔ ایضاً، ص ۶۸ ۱۹۔ ایضاً، ص ۷۰
۲۰۔ فراق گورکھپوری، کلیاتِ فراق گورکھپوری، مرتب: عباس تابش، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۔ ایضاً، ص ۳۱
۲۲۔ ایضاً، ص ۳۵ ۲۳۔ ایضاً، ص ۴۰ ۲۴۔ ایضاً، ص ۳۴۰

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۴۱　۲۶۔ ایضاً، ص ۴۴

۲۷۔ پرویز شہریار، فراق گورکھپوری کی غزل گوئی، مشمولہ: فراق گورکھپوری شاعر، نقاد، دانشور، مرتب: گوپی چند نارنگ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۶۷

۲۸۔ داؤد اشرف، مخدوم ایک مطالعہ، آندھرا پردیش، انجمن تحفظ اُردو، ۱۹۶۷ء، ص ۵۶

۲۹۔ مخدوم محی الدین، بساطِ رقص، حیدر آباد: اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۱

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۳۳　۳۱۔ ایضاً، ص ۱۳۱　۳۲۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۳۳۔ مخدوم محی الدین، پیمانہ غزل، جلد اول، تالیف محمد شمس الحق

۳۴۔ ایضاً، ص ۴۰۶

۳۵۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور، مکتبہ کارواں، س ن، ص ۵۱۱

۳۶۔ ظفر اقبال، ڈاکٹر، ترقی پسندی اور فیض، اُردو شاعری کا صدر دروازہ، فیض احمد فیض، فیصل آباد: ادارہ تالیف و ترجمہ جی سی یونیورسٹی فیصل آباد۔ ۲۰۱۲ء، ص ۵۰

۳۷۔ نسخہ ہائے وفا، ص ۸۵

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۰۶　۳۹۔ ایضاً، ص ۳۰۶　۴۰۔ ایضاً، ص ۲۲۵　۴۱۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۱۸　۴۳۔ ایضاً، ص ۲۲۱　۴۴۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۴۵۔ قمر رئیس، پروفیسر، فیض کی غزل، اردو غزل، مرتبہ: ڈاکٹر کامل قریشی، لاہور: پراگریسو بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۲۷۴

۴۶۔ نسخہ ہائے وفا، ص ۴۸۷

۴۷۔ کیفی اعظمی، سرمایہ، نئی دہلی: معیار پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۲۸۶

۴۸۔ شکیلہ رافت علی، ڈاکٹر، کیفی اعظمی فکر و فن، دہلی: معیار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۶

۴۹۔ سرمایہ، ص ۲۷۶

۵۰۔ ایضاً، ص ۲۵۹　۵۱۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۵۲۔ کیفی اعظمی، فکر و فن، ص ۱۹۶

۵۳۔ سرمایہ، ص ۲۳۶

۵۴۔ ظہیر کاشمیری، عشق و انقلاب، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۵۹

۵۵۔ ایضاً، ص ۳۷　۵۶۔ ایضاً، ص ۱۰۶　۵۷۔ ایضاً، ص ۶۷

۵۸۔ ایضاً، ص ۹۷　۵۹۔ ایضاً، ص ۹۴

۶۰۔ ایضاً، اندرونی فلیپ

۶۱۔ ساحر لدھیانوی، کلیاتِ ساحر، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء، ص ۲۶

۶۲۔ ایضاً، ص ۴۷　۶۳۔ ایضاً، ص ۵۲　۶۴۔ ایضاً، ص ۵۵　۶۵۔ ایضاً، ص ۵۵

۶۶۔ ایضاً، ص ۵۵　۶۷۔ ایضاً، ص ۱۸۱　۶۸۔ ایضاً، ص ۳۳۷　۶۹۔ ایضاً، ص ۳۳۷